کارڈینل فرانسس اَرنزے

اکیسویں صدی میں مسلم- مسیحی روابط

[کارڈینل فرانسس اَرنزے نائجیریا سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے ملک میں آرچ بشپ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں پوپ جان پال دوم نے اُنہیں روم بلا لیا، اور اُسی وقت سے "پاپائی کونسل برائے مکالمہ بین المذاہب" کے سربراہ ہیں۔ اُنہوں نے گزشتہ سال جون میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی- سی کے "مرکز برائے مسیحی- مسلم تفہیم" میں مندرجہ بالا موضوع پر خطاب کیا تھا۔ جریدہ Encounter (روم) بابت نومبر ۱۹۹۷ء میں اُن کے خطاب کا متن شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ مدیر]

مسیحی، دُنیا کی کل آبادی کا ۳۳ فیصد ہیں اور مسلمان کوئی ۱۸ فیصد۔ اس طرح مسیحی اور مسلمان مل کر عالمی آبادی کے نصف سے زیادہ ہیں، مزید برآں دوسرے مذہبوں کے بالمقابل مسیحیت اور اسلام جغرافیائی اعتبار سے زیادہ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

آج جب اکیسویں صدی، دہلیز پر کھڑی ہے، یہ بات نہ صرف اسلام اور مسیحیت، بلکہ دُنیا کے لیے اہمیت کی حامل ہے کہ ان دو مذاہب کے پیروکار ایک دوسرے سے کس طرح کی رہ و رسم رکھتے ہیں اور باہمی روابط کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

میں "مرکز برائے مسیحی - مسلم تفہیم" کا از حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے "اکیسویں صدی میں مسلم- مسیحی روابط" پر آپ کے سامنے چند گزارشات پیش کرنے کی دعوت دی۔

مسلمان اور مسیحی اگلی صدی میں، کس قسم کے روابط کے خواہش مند ہیں؟ کون سی پیچیدہ مشکلات اور چیلنج ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے؟ اور ان مشکلات پر قابو پانے، اور چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ ہماری گزارشات اِن اُمور پر مرکوز ہوں گی۔

خوشگوار روابط

۱۔ دوسرے فریق کے بارے میں بہتر معلومات

اگر کوئی عزت و احترام پر مبنی بارآور ربط و تعلق کی خواہش رکھتا ہے تو اُس کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ فریقِ دیگر کے بارے میں باخبر ہو۔ نیک خواہشات ضروری ہیں، مگر بارآور تعلقات کے لیے

کافی نہیں۔ اگر بین المذاہب ربط و تعلق کو گرو ہی اور عمومیت کی معمولی سطح پر رکنا نہیں ہے تو اس کے لیے دوسرے مذہب کے باضابطہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ دونوں مذہبوں میں جو لوگ قیادت یا ذمہ داری کے مناصب پر ہیں، اُن کا اپنے عام ہم مذہبوں کی نسبت کہیں زیادہ فرض بنتا ہے کہ دوسرے مذہب کا گہرا مطالعہ کریں۔

متعدد ایسے مواقع اور تقریبات ہیں جو مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان جان پہچان کا باعث ہیں۔ ان مواقع میں ایک دوسرے کی دوستانہ دعوتوں کے ساتھ وہ تقریبات شامل ہیں جو ایک فرد کی زندگی میں اہم ہوتی ہیں۔ مثلاً بچے کی پیدائش، شادی بیاہ، بچے کی مذہبی تعلیم کے آغاز اور خاندان کے کسی فرد کی موت پر یک جائی۔ ایسے مواقع پر دوسرے مذہب کے پیروکار دوستوں سے تقریباتی مراسم اور ان کے ثقافتی اثرات پر سننا بہت معلومات افزا ہوتا ہے۔ مسیحی اور مسلمان ایک دوسرے کو بتا سکتے ہیں کہ وہ روزوں کے دنوں کا کیسے استقبال کرتے ہیں اور وہ اپنی مذہبی عیدیں کیسے مناتے ہیں۔

مذکورہ بالا پیراگراف میں جس قسم کی معلومات پر گفتگو کی گئی ہے، یہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ باہم گفتگو سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں، تاہم سیاسیات، عمرانیات، تاریخ اور مذہبی علوم کے دائروں میں زیادہ متخصصانہ مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مطالعات کوئی نئے نہیں۔ برس ہا برس سے یہ مطالعات جامعات کے نصابوں کا حصہ ہیں، البتہ جو بات نئی ہے وہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان تعاون و اشتراک کار کا فزوں تر جذبہ ہے۔

اس موقع پر میں "مرکز برائے مسلم۔ مسیحی تفہیم" کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چند برسوں میں اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ میں اس موقع پر یہ بھی بتا دوں کہ تقریباً دس سال سے پاپائی گریگورین یونیورسٹی (Pontifical Gregorian University) اور انقرہ یونیورسٹی کے درمیان اساتذہ کا تبادلہ جاری ہے۔ ابھی حال ہی میں جامعہ الزیتونہ - تیونس اور "پاپائی ادارہ برائے مطالعہ اسلامیات و عربی" (Pontifical Institute of Arabic and Islamic Studies)، نیز جامعہ الزیتونہ اور گریگورین یونیورسٹی کے درمیان اساتذہ و طلبہ کے تبادلے کا آغاز ہوا ہے۔

۲۔ دوسرے فریق کے وجود کو تسلیم کرنا اور اختلافات کا احترام کرنا

دوسرے فریق کے بارے میں صحیح اطلاعات سے مسیحیوں اور مسلمانوں پر واضح ہو گا کہ ان کے مذاہب میں بہت سے عقائد مشترک ہیں۔ ایک خدا جو قوی و رحیم ہے، پر ایمان، انبیاء کے کردار پر اتفاق، روز آخرت کے حقائق یعنی جزاء و سزا کا یقین اس اشتراک کی چند مثالیں ہیں، تاہم بنیادی

اختلافات اپنی جگہ ہیں۔ مسیحیوں کا عقیدہ تثلیث اور تجسیم خداوند انسانوں کے درمیان تعلق کو مکمل طور پر ایک دوسری شکل دے دیتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں قرآن کو آخری وحی کی جو حیثیت حاصل ہے، اور حضرت محمد ﷺ کو انبیاء کی مہر کی جو حیثیت دی گئی ہے، یہ اسلام کو ایک خصوصی شکل دے دیتی ہے۔

اسی طرح اخلاق کے دائرے میں اتفاق اور اختلافات کے نقاط ہیں۔ مختلف مذہبوں کے پیروکاروں کی ایک مشترک تشویش یہ ہے کہ معاشرے میں مذہب کا ایک مناسب مقام ہے، مادیت پرستی پر قابو پایا جائے، خاندان کا ادارہ برقرار رہے اور جنسی بے راہ روی کی مخالفت کی جائے۔ اس اتفاق و اشتراک کے باوجود دونوں کے ہاں معاشرے اور قانون، شادی بیاہ اور خاندان کے تصورات مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں۔

واقعی مکالمے کا تقاضا ہے کہ مسلمان اور مسیحی دینیاتی، اخلاقی اور ثقافتی معاملات میں اپنے تمام تر اختلافات اور یکسانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کو قبول کریں، اور دوسرے فریق کے لیے احترام کا رویہ رکھیں۔ پوپ جان پال دوم نے ۹ جنوری ۱۹۹۳ء کو اسیسی (Assisi) میں یورپ، اور بالخصوص، خطہ بلقان میں امن کے لیے دعائیہ شب بیداری میں کہا تھا: "ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنا، اور اس رویے سے جنم لینے والے باہمی احترام، جسے محبت سے مضبوط تر کیا گیا ہو، میں پوری انسانیت کی آخر الامر مصالحت کار راز مضمر ہے۔"

دنیا بھر کے کیتھولک بشپوں نے جو ۱۹۶۵ء میں دوسری ویٹی کن کونسل میں یکجا ہوئے تھے، اُن لوگوں کے احترام و محبت پر زور دیا تھا جو ہم سے مختلف انداز میں سوچتے ہیں۔ اگر ہم اُن سے مکالمہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ تو بشپوں کے الفاظ میں "احترام و محبت اُن لوگوں تک بھی وسیع ہونا چاہیے جو مذہبی، سیاسی اور سماجی معاملات میں ہم سے مختلف انداز میں سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم رأفت و محبت سے اُن کے اندازِ فکر کو جس قدر دقتِ نظر سے سمجھیں گے، اتنی ہی آسانی کے ساتھ اُن سے مکالمہ کر سکیں گے۔"

۳۔ مکالمے میں عملی شرکت

جب مسلمان اور مسیحی ایک دوسرے کو سمجھنے لگتے ہیں، اور ایک دوسرے کو تسلیم کرنا اور باہم احترام و محبت سے پیش آنا سیکھ لیتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی شکل میں مسلم۔ مسیحی مکالمے میں شرکت کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح تیار پاتے ہیں۔ بالعموم بین المذاہب تعلقات کی چار شکلیں بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی شکل روزمرہ زندگی میں خاندان، کاروبار اور دوسری سماجی سرگرمیوں میں ہر سطح پر مذہبی

سرحدوں کے آرپار روابط کا دائرہ ہے۔ اس دائرے میں مذہب کو سرے سے زیرِ بحث لائے بغیر ہی باہمی معاملات کا موقع ملتا ہے۔ دوسری شکل ارضی و سماوی آفات کے متاثرین اور پناہ گزینوں کو امداد فراہم کرنے میں بین المذاہب تعاون ہے۔ دینیاتی موضوعات ایک اور شکل ہیں۔ روحانیت کے حوالے سے مشترکہ اجلاسوں میں مذہبی تجربے پر تبادلہ خیال بین المذاہب تعلقات کی چوتھی اور آخری شکل ہے۔

اگر مسلم۔ مسیحی روابط کو محض ایک مشق سے بلند تر کرنا ہے تو ایک مخلص مسیحی یا مسلمان سے اس امر کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے ذہنی کشادگی اور کسی نہ کسی شکل میں باہمی تعاون کے لیے تیار ہوگا۔

۴۔ مشترک اقدار کے لیے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ گواہی

بعض لوگوں کا الزام ہے کہ تاریخ کے ایوانوں میں ہمیشہ مذہب تنازعات اور عداوتوں کا بنیادی سبب رہے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ، مذہبی نقطہ نظر سے اپنے آپ کو کسی مذہب سے منسلک نہیں کرتے اور اپنی پوزیشن کو انسانیت دوستی پر مبنی سمجھتے ہیں۔ وہ مذاہب کے مثبت کارناموں کے تسلیم کرنے میں تشکیک کا شکار ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ نجی اور عوامی زندگی سے مذہب کو جس قدر خارج کیا جائے گا، اسی قدر زیادہ اُمید ہے کہ معاشرے میں ہم آہنگی اور قربت پیدا ہوگی۔

کوئی سنجیدہ مسیحی یا مسلمان یہ نقطہ نظر تسلیم نہیں کرے گا، مگر الزام رد کر دینا ہی کافی نہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں، حقیقتاً دوسرے اہلِ ایمان کے لیے بھی، یہ ضروری ہے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے سے پیش آئیں کہ خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والا ہر فرد مذاہب کو بدنام کرنے کے اس رویّے کی بطالت بچشم خود دیکھ لے۔

مسیحیوں اور مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اکیسویں صدی میں باہم ایسی ہم آہنگی کو ترقی دیں اور مختلف مذہبی شناخت قائم رکھتے ہوئے دُنیا کو دکھا دیں کہ وہ ذاتِ خداوندی کے احترام میں شانہ بشانہ کھڑے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ انسانی روابط میں خداوند کی مرضی اور قانون کی اتباع کی جائے۔

مسیحیت اور اسلام دونوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کے پاس ایک عالمی پیغام ہے جسے مسیحی مشن یا اسلامی دعوت و تبلیغ کے ذریعے دوسروں تک پہنچنا ہے۔ ہر فرد کے اس حق کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اُسے اپنے مذہب کی اشاعت کی اُس وقت تک اجازت ہے، جب تک یہ انسانی وقار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انجام پا رہی ہے۔ مذہب کے نام پر دوسروں کو کوئی نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔ "سنہری اصول" جو دونوں مذہب سکھاتے ہیں، یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کیجیے، جیسے سلوک کی توقع تم اُن

سے کرتے ہو۔

حقیقی مذہب تشدد، تناؤ یا نفرت کا سبب نہیں۔ ہر قابلِ ذکر مذہب دوسروں کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کو محض ایک دوسرے کی موجودگی میں زندہ رہنا ہی نہیں ہے، بلکہ اُنہیں معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں تعاون بھی کرنا چاہیے۔ اگر ان کے رہنما اُنہیں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی ترغیب نہیں دیتے تو کیا ہمیں یہ بات تسلیم نہ کر لینا چاہیے کہ یہ رہنما ناکام ہو چکے ہیں؟

۵۔ امن کی مشترک ترویج

مسیحیت اور اسلام میں جو مشترک اقدار ہیں، ان میں امن اور سلامتی خصوصی ذکر کی متقاضی ہیں۔ دونوں مذہب امن و سلامتی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ یسوع نے مصائب سے گزرنے اور مرنے سے پہلے کی رات میں اپنے رسولوں کو کہا تھا: "میں تمہیں اطمینان [امن و سلامتی] دیے جاتا ہوں۔ اپنا اطمینان تمہیں دیتا ہوں۔ جس طرح دُنیا دیتی ہے، میں تمہیں اس طرح نہیں دیتا (یوحنا: ۱۴: ۲۷)۔" مُردوں میں سے جی اٹھنے کے بعد جب وہ اپنے رسولوں پر ظاہر ہوا، تو یسوع نے بالعموم اِس تبریک کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔ "تمہاری سلامتی ہو (یوحنا ۲۰: ۱۹، ۲۱، ۲۶)۔" سینٹ پال نے یسوع مسیح کو "ہماری سلامتی" (افسیوں کے نام خط، ۲: ۱۴) کہا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں امن و سلامتی یعنی "السلام" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ کیا یہ حقیقت مسلمانوں کے درمیان رواجی ہدیہ تبریک "السلام علیکم" کی اہمیت کو اور زیادہ نہیں کر دیتی؟

امن و سلامتی افراد کے لیے ضروری ہے، ایک ہی مذہبی برادری کے درمیان، دو یا دو سے زیادہ مذاہب کے درمیان، لوگوں کے درمیان اور ریاستوں کے درمیان بھی۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ نظم و ضبط کی اِس راحت کو فروغ دیں۔ کسی صحیح الفکر مسلمان یا مسیحی کو صلیبی جنگوں یا قتال کی تائید نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کا طرزِ عمل نسل پرستی کی مصلحتوں سے آلودہ ہونا چاہیے اور نہ مذہب، طرزِ زندگی اور رنگ و نسل کی بنیاد پر ہی وہ امتیازی سلوک پر عمل پیرا ہوں۔

دوسری ویٹی کن کونسل مسلمانوں اور مسیحیوں کو "امن و آزادی، اخلاقی اقدار اور عدل اجتماعی کے تحفظ اور افزائش" کے لیے ترغیب دیتی ہے۔ ۳ نومبر ۱۹۹۴ء کو روم میں "ورلڈ کانفرنس آن ریلیجن اینڈ پیس" کی چھٹی عالمی اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے پوپ جان پال دوم نے مختلف نمائندوں کے سامنے امن کی ترویج و بقاء کے لیے مشترک لگاؤ اور اخلاص پر زور دیا تھا۔ "آج مذہبی رہنماؤں کو واضح طور پر دکھانا چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ و ایمان کے سبب امن کی ترویج کا عہد کیے ہوئے

ہیں۔"

مسیحی اور مسلم والدین، رہنماؤں اور اساتذہ کو امن و سلامتی کے ساتھ مخلصانہ وابستگی کی ضرورت کا اس حد تک قائل ہونا چاہیے کہ وہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان امن و سلامتی کے قیام وبقاء کا آغاز کرتے ہوئے امن و سلامتی سے اپنی وابستگی کا اظہار خاندان، سکول، ذرائع ابلاغ اور بالخصوص مسجد اور کلیسیاء کی سطح پر کر سکیں۔ اُن خاندانوں کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرنا اچھا ہے جن کے بعض افراد مذہب کے نام پر ہونے والے تشدد میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں، لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر ضرورت اس امر کی ہے کہ فرد اپنے ہم مذہبوں کو سمجھائے کہ دوسروں کے وجود کو تسلیم کیا جائے، اُنہیں احترام دیا جائے اور امن و سلامتی کے فروغ کے لیے اُن کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ پوری انسانیت جس صدی میں داخل ہونے والی ہے، اس کے لیے مسیحی - مسلم تعلقات کا یہ پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔

☆رکاوٹیں اور چیلنج

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کا راستہ آسان ہے اور نہ ہموار ہی۔ سچی بات یہ ہے کہ رکاوٹیں ہیں اور چیلنج بھی، اِن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ ماضی کا بوجھ

حال اور مستقبل کا انحصار ایک حد تک ماضی پر ہے۔ جس برادری کا حافظہ نہیں، اُس کا کوئی مستقبل نہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان تعلقات ہمیشہ پُر امن اور خوشگوار نہیں رہے ہیں۔ تناؤ، تنازعات، صلیبی جنگیں اور جہاد چنداں اجنبی نہیں۔ کسی کو نوآبادیاتی دور کے اثرات سے صرفِ نظر کرنا چاہیے اور نہ اس کے تصورات سے۔

دوسری ویٹی کن کونسل یہ اُمور تسلیم کرتی ہے اور ایک نئے جذبے کی دعوت دیتی ہے:

"اگرچہ صدیوں پر محیط عرصے میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان متعدد جھگڑوں اور عداوتوں نے جنم لیا ہے، تاہم یہ مقدس ترین سنڈ (Synod) سب سے التماس کرتی ہے کہ ماضی کو بھلا کر باہمی تفہیم کے لیے مخلصانہ کوشش کریں۔" ۱۹ اگست ۱۹۸۵ء کو پوپ جان پال دوم نے آٹھ ہزار مسلمان نوجوانوں سے کاسابلانکا سٹیڈیم میں خطاب کرتے ہوئے ان ہی جذبات کا اظہار کیا اور ایسی تلخ تاریخی یادیں ذہن سے محو کر دینے پر زور دیا۔

۲۔ خود احتسابی کا فقدان

مسیحیوں کو اُن کا مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر روز، بالخصوص غروب آفتاب کے بعد، دن بھر

کے اپنے عمل کا جائزہ لیں، اگر انہوں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس سے توبہ کریں اور اس کے لیے خداوند سے معافی کے خواستگار ہوں۔ مسیحی عبادت کا سب سے اعلیٰ عمل یعنی یوخارستی قربانی ہمیشہ ایسی استغفاری رسم سے شروع ہوتی ہے۔ توبہ و استغفار کے ساکرامنٹ میں ہر مسیحی اپنے گناہوں کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔ میں اپنے مسلمان دوستوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا اسلام میں اس سے ملتا جلتا کوئی عمل ہے!

خود احتسابی کسی کمزوری کی علامت نہیں۔ یہ تو ذمہ دار ہونے کا ثبوت ہے۔ اس سے افراد کے درمیان، اور اسی طرح برادریوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے اور انہیں مضبوط تر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ مسلم - مسیحی تعلقات کے حوالے سے جہاں خود احتسابی کا فقدان ہے، وہاں دوسروں پر تنقید کر کے ہی لوگ مطمئن ہیں۔ تعمیری اور دیرپا تعلقات کے راستے میں یہ صورت حال ایک واقعی رکاوٹ ہے۔

۳۔ سیاست کے ہاتھوں مذہب کا استحصال

بعض مواقع پر مذاہب کے لیے ترغیب ہوتی ہے کہ وہ سیاست دانوں کے ہاتھوں استعمال ہو جائیں، اور اس سے کہیں زیادہ ترغیب سیاست دانوں کے لیے موجود رہتی ہے کہ وہ مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیں۔ چونکہ مذہبی وابستگیاں مضبوط ترین محرکات میں شامل ہوتی ہیں، اس لیے ایک غیر محتاط سیاست دان کی خواہش ہو سکتی ہے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہب کو استعمال کرے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ لوگوں کو جنگوں میں شریک کرنے کے لیے مذہب کا ناجائز سہارا لیا گیا ہے، حالانکہ ان جنگوں کے اصل اسباب سیاسی، اقتصادی یا نسلی ترجیحات تھیں۔ یہ رنج والم کی بات ہے، از حد افسوس ناک ہے۔ یہ مذہب کی کوئی خدمت ہے اور نہ سیاست ہی کی۔

دُنیا کے بعض حصّوں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ حکومتوں یا سیاسی جماعتوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے، یا کسی خاص مذہبی یا سیاسی گروہ کو کمزور کرنے کے لیے فرقہ وارانہ اور انتہا پسندانہ تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

غور و فکر سے مسیحی اور مسلم رہنماؤں کے درمیان اس امر پر اتفاق ہو سکتا ہے کہ سیاست دانوں کے اپنے اہداف ہیں اور ان کے حصول کے طریقے بھی اُن کے اپنے ہیں۔ ان سیاست دانوں سے یہ توقع ہونا چاہیے کہ وہ مذاہب کو اپنے اہداف مقرر کرنے، نیز عبادت اور ہمسائے کی خدمت کرنے کے دائروں میں اُن کی آزادی کا احترام کریں۔

۴۔ مذہبی جنون یا انتہا پسندی

مسلم - مسیحی تعلقات کی راہ میں مذہبی جنون یا انتہا پسندی رکاوٹ ہے۔ مذہبی انتہا پسند یا جنونی اپنے مذہب کو اس کی حقیقی اور خالص شکل میں دیکھنے کی خواہش کے تحت متحرک ہو سکتا ہے، لیکن انتہا پسند بالعموم اپنے طے کردہ ہدف کو آج کے دور میں ایسے اعمال کے سخت گیرانہ نفاذ کی شکل میں حاصل کرنا چاہتا ہے جو ایک دوسرے وقت اور ثقافت کا جزو لاینفک تھے۔

انتہا پسندی بالعموم ہم مذہبوں یا مختلف نقطہ نظر رکھنے والوں، یا معاشرے کے ایک دوسرے تصوّر کے حاملین کے بالمقابل ایک غیر مصالحانہ روّیے سے پہچانی جاتی ہے۔ آئے دن انتہا پسندی تشدّد پر منتج ہوتی ہے۔ بعض انتہا پسند اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ وہ اُن لوگوں کو مذہبی آزادی دینے سے انکار کر دیتے ہیں جن کی مذہبی وابستگیاں اُن سے مختلف ہیں، اور اُن کو روزِ آخرت کی نجات سے خارج سمجھتے ہیں۔

کس کی رائے نہ ہوگی کہ مسیحی - مسلم تعلقات کو فروغ دینے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے؟

۵۔ انسانی حقوق اور بالخصوص مذہبی آزادی کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر

بنیادی حقوق، اور بالخصوص مذہبی آزادی کے موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر کے نتیجے میں مسیحی - مسلم تعلقات مشکلات کا شکار ہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک انسان کو خداوند کی شبیہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ سب لوگ یسوع مسیح، ابن اللہ، کے بھائی اور بہنیں ہیں۔ تجسیم خداوندی نے تمام انسانوں کو معزز کر دیا ہے۔ یہ انسانی وقار کی حقیقی بنیاد ہے۔ مزید براں تمام انسانیت کے فدیے کے طور پر یسوع مسیح نے صلیب پر جان دی - پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ خداوند کی محبت ہمسایے کی محبت سے ہو کر گزرتی ہے۔

مسلم تصوّر جدا ہے۔ انسان خدا کا بندہ ہے، اور مخلوقات میں خداوند کا خلیفہ ہو کر بھی بندہ ہی رہتا ہے۔ اِس تصوّر کا اظہار مسلمانوں کے ناموں سے ہوتا ہے۔ متعدّد مسلمانوں کے نام لفظ عبد (بندہ) سے شروع ہوتے ہیں جس کے ساتھ خداوند کے صفاتی نام آتے ہیں۔ [جیسے عبدالرحمٰن، عبدالرحیم وغیرہ]

مسیحیوں کے نزدیک انسان خداوند کی مخلوق ہے جسے کچھ ناقابلِ انتقال حقوق حاصل ہیں۔ ان حقوق میں نمایاں مذہبی آزادی کا حق ہے۔ "اِس آزادی کا مطلب یہ ہے کہ تمام افراد دوسرے افراد یا سماجی گروہوں اور کسی بھی انسانی طاقت کے دباؤ سے اِس طرح محفوظ ہیں کہ مذہبی معاملات میں کسی کو اُس کے اپنے عقائد کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کسی کو اپنے عقائد کے مطابق

حقیقی حدود کے اندر رہتے ہوئے نجی طور پر یا کھلے عام، تنہا یا اجتماعی طور پر، عمل کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔"

بنیادی حقوق کا ادراک مسلمانوں کے نزدیک کچھ مختلف ہے۔ غالب مسلم اکثریت رکھنے والے بعض ممالک اقوام متحدہ کے "بنیادی حقوق کے عالمی اعلامیہ (۱۹۴۸ء)" کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں۔ وہ اسے مغربی ثقافت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ اسلام میں "بنیادی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں، جو ۱۹۸۱ء میں پیرس میں پیش کیا گیا تھا، مذہبی آزادی کے حق پر ایک دفعہ شامل ہے (دفعہ ۱۳)، تاہم یہ بہت مختصر ہے، محض یہ کہا گیا ہے: "ہر شخص کو آزادی عقیدہ اور اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کی آزادی حاصل ہے۔ لکم دینکم ولی دین (الکافرون: ۶)۔" اگلی دفعہ "دعوت و تبلیغ" کے حق سے متعلق ہے، مگر دفعہ کا مفہوم غیر واضح ہے۔ یہ واضح نہیں کہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے مذاہب کی نشر و اشاعت کا حق حاصل ہے۔ اس حق کا یقیناً کوئی ذکر نہیں کہ کوئی اپنا مذہب تبدیل کر لے۔

پس انسانی عظمت اور اس سے جنم لینے والے حقوق کا سوال ایسا موضوع ہے جس پر مسیحی اور مسلمان، جو ایک دوسرے کو جان چکے ہیں اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، انسان کی، اور بالواسطہ دُنیا کی بہتر خدمت کی اُمید میں تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔

۶۔ دو طرفہ روّیے

مذہبی آزادی جہاں افراد کا حق ہے، وہیں مذہبی گروہوں کا بھی ہے۔ اس میں مذہب پر عمل کرنے کے علاوہ دوسروں کے ساتھ مذہبی مراسم میں شریک ہونا بھی شامل ہے۔ اس حق پر عمل درآمد کی کوئی جغرافیائی حدیں نہ ہونا چاہئیں۔ اس حق کا اطلاق تمام ملکوں پر ہوتا ہے، چاہے وہ مسلم اکثریتی ملک ہوں یا مسیحی اکثریتی۔ کسی مذہب کو اپنے پیروکاروں کے لیے اُس ملک میں [جہاں وہ اقلیت میں ہیں] آزادی مذہب کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے، جب وہ اپنی اکثریت کے ملک میں یہی حق دوسرے مذہبوں کے ماننے والوں کو نہیں دیتا۔ اسی بات سے دو طرفہ روّیوں کا تعلق ہے۔

۲۱ جون ۱۹۹۵ء کو جس روز روم میں پہلی مسجد کا افتتاح ہوا، پوپ جان پال دوم نے اپنے سامعین سے اس دو طرفہ روّیے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا: "آج روم میں ایک عظیم الشان مسجد کا افتتاح ہوا ہے۔ یہ واقعہ اس مذہبی آزادی کا منہ بولتا اظہار ہے جو یہاں ہر مذہب کے ماننے والے کے لیے تسلیم شدہ ہے۔ اور یہ بات بہت اہم ہے کہ روم، جو مسیحیت کا مرکز اور پطرس کے جانشین کی مسند ہے، میں آزادی ضمیر کے پورے احترام کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی عبادت گاہ ہونا چاہیے۔ اس

اہم موقع پر یہ اظہار کرنا ضروری ہے کہ بد قسمتی سے بعض اسلامی ملکوں میں مذہبی آزادی تسلیم کرنے کے اس جیسے نشانات موجود نہیں۔ اور دُنیا، ہزارہ سوم کی دہلیز پر اس قسم کے نشانات کے لیے چشم براہ ہے۔ مذہبی آزادی اب متعدد بین الاقوامی دستاویزات کا حصہ بن چکی ہے اور معاصر معاشرے کے ستونوں میں سے ایک ہے۔"

میں نے مسلم - مسیحی تعاون کی راہ میں حائل متعدد رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے۔ شاید انہیں چیلنج سمجھنا زیادہ بہتر اور صحیح تر ہے، کیونکہ رکاوٹوں کو اس طرح دیکھنے سے کچھ اُمید پیدا ہوتی ہے کہ ان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہی بات ہماری تیسری اور آخری بحث ہے۔

☆ چیلنجوں سے عہدہ برا ہونے کے راستے

۱۔ تاریخی یادوں کا اندمال

مسلم - مسیحی تعلقات کی تاریخ کا مطالعہ پورے اخلاص اور سچائی سے کیا جانا چاہیے۔ ماضی کی اغلاط کو تسلیم کیا جانا چاہیے اور ان پر افسوس کا اظہار کیا جانا چاہیے۔ غلطی کرنے والوں کو معافی مانگنا چاہیے اور انہیں معاف کر دیا جائے، اسی صورت میں مصالحت ممکن ہے۔ میں نے ۱۹۹۵ء میں رمضان کے خاتمے پر مسلمانوں کے نام پیغام میں لکھا تھا کہ حقیقی مصالحت کے بغیر ہم اپنے ہم مذہبوں اور دُنیا کی فلاح کے لیے یکسو نہیں ہو سکتے۔

ماضی کے مخلصانہ مطالعے میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر کسی برادری نے علم و ثقافت [کی ترویج و اشاعت] میں حصہ لیا ہے تو اسے خراج تحسین پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر عربوں کا، جو زیادہ تر مسلمان ہیں، مغربی تہذیب میں حصہ ہے۔ ظہور اسلام سے صدیوں پہلے مسیحی برادریاں مشرق وسطیٰ میں موجود تھیں اور عربی ثقافت نے بہت کچھ اُن سے لیا ہے۔ مستقبل کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ماضی کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ "مرکز برائے مسلم - مسیحی تفہیم" جیسا ادارہ ماضی میں مسلم - مسیحی اشتراک و تعاون سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے مطالعات کو فروغ دے سکتا ہے، نیز مستقبل کے لیے ماڈل بھی تجویز کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ خود احتسابی پر عمل کی تعلیم

خود احتسابی کا مشکل کام سیکھنا پڑے گا۔ پوپ جان پال دوم کی خواہش ہے کہ کیتھولک چرچ اپنے اجتماعی ضمیر کا جائزہ لے کہ ہزارہ دوم میں اُس کے پیروکار، سال ۲۰۰۰ء کی تیاریوں سے

حوالے سے کیوں ناکام ہوئے ہیں۔ پوپ جان پال دوم کے الفاظ میں چرچ کو "اپنے پیروکاروں کی گناہ گاری سے کاملاً آگاہ ہونا چاہیے، اور تاریخ کے اُن تمام ادوار کو یاد کرنا چاہیے جب اُنہوں نے یسوع مسیح اور اُس کی انجیل کی روح سے قطع تعلق کر لیا، اور دُنیا کے سامنے ایمانی اقدار سے جنم لینے والی گواہی پیش کرنے کے بجائے اُنہوں نے اس طرح سوچا اور عمل کیا جو گواہی کے بالکل اُلٹ اور غلط تھا۔ اگرچہ چرچ یسوع مسیح کی ذات میں شمولیت کے باعث مقدس ہے، تاہم چرچ توبہ واستغفار سے اکتا نہیں جاتا۔ خداوند اور انسان کے سامنے وہ اپنے گناہ گار پیروکاروں کو اپنا ہی تسلیم کرتا ہے۔"

اگر مسلمان اسی طرز کی کوشش کریں گے تو مسیحیوں اور اُن کے باہمی روابط زیادہ مشکل نہ رہیں گے۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے، خود احتسابی قوت اور شفافیت کا نشان ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ چار سال پہلے "پاپائی کونسل برائے مکالمہ بین المذاہب" اور دُنیا کی چار اہم مسلم تنظیموں کے درمیان جو رابطہ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، وہ اس طرز کی خود احتسابی میں فریقین کو مدد دے رہی ہے۔ اسی بات کی سفارش بین المذاہب تعلقات کے لیے کوشاں دوسرے مسلم۔ مسیحی گروہوں کے لیے بھی کی جاتی ہے۔

۳۔ مذہب کو سیاسی استحصال سے آزاد کرایے۔

سیاست دان جس طرح مذہب کو استعمال کرتے ہیں، ان کے بالمقابل مسیحی اور مسلمان رہنما غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ مذہب کو عقائد و اعمال اور زندگی پر توجہ مرکوز رکھنے کے لیے ضروری آزادی حاصل ہونا چاہیے۔ سیاست دانوں اور حکومتوں کو تمام مذاہب کے لیے غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ وہ مذہبی رہنما جو کسی سیاسی جماعت کے ہاتھوں اپنے مذہب کو استعمال کیے جانے کی ترغیب کے سامنے جھک جاتے ہیں، اُنہیں صورتِ حال کے منفی اثرات پر بھی گفتگو کرنا پڑے گی۔ ان منفی اثرات میں یہ امر بھی شامل ہے کہ سیاسی جماعت کے برسرِ اقتدار نہ رہ سکنے کی صورت میں اُن کا مذہب نفرت کا شکار ایک حد تک کی مانند ہوگا۔ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کا وقتاً فوقتاً مل بیٹھ کر ان سوالوں پر بحث و گفتگو کرنا مفید ثابت ہوگا۔

۴۔ مذہبی انتہا پسندی کا مقابلہ اور مذہبی آزادی کا فروغ

مسلمانوں اور مسیحیوں کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ہم ایک ایسی دُنیا میں رہ رہے ہیں جس میں تکثیریت ایک حقیقت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں (البقرہ: ۲۵۶)،" اس لیے مذہب کی طرف دعوت دی جاتی ہے، کسی پر یہ تھوپا نہیں جاتا۔ مذہبی اتحاد جو جسمانی، نفسیاتی، اقتصادی، سماجی یا کسی اور قوت کے نتیجے میں حاصل ہو، انسان کے شایانِ شان نہیں۔ اور نہ

یہ خداوند کے حضور کوئی صحیح نذرانہ ہے۔ مذہبی جنونیوں کی رائے کا بدلنا از حد ضروری ہے۔

اُن لوگوں کے لیے جو مذہب کے نام پر تشدد کرتے ہیں، اُن کی طرف سے یہ خداوند اور مذہب کی سخت توہین ہے۔ پوپ جان پال دوم نے "مذہب اور انصاف کے موضوع پر عالمی کانفرنس" سے اپنے خطاب [نومبر ۱۹۹۴ء] میں فرمایا تھا: "وہ شخص اپنے آپ کو خدائے بزرگ و رحیم کا مطیع نہیں قرار دے سکتا جو اسی خدا کے نام پر اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے۔ مذہب اور امن و سلامتی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مذہب کے نام پر جنگ چھیڑنا ایک کھلم کھلا تضاد ہے۔"

ضرورت اِس بات کی ہے کہ دور اندیش مذہبی رہنما اور صاحب دانش سیاسی مدبر لوگوں کو یہ ماننے پر آمادہ کریں کہ آزادی مذہب عزیز ترین انسانی حقوق میں سے ایک ہے اور کسی کو اِس حق کے استعمال سے محروم نہ ہونا چاہیے، بشرطیکہ دوسرے لوگوں کے اصل حقوق کی خلاف ورزی نہ ہو۔

۵۔ ترقی و انصاف کا فروغ

غربت، اقتصادی پس ماندگی، بے انصافی اور کرپشن جیسی خامیاں انتہا پسندانہ مذہبی رجحانات کے نشو و نما پانے اور ابھرنے کے لیے زرخیز زمین ثابت ہوتی ہیں۔ مذکورہ کمزوریوں کے حامل معاشروں میں رواں صورتِ حال کو رد کرنے اور برسرِ اقتدار حکومت کی مخالفت کرنے والے لوگوں کے لیے یہ بات آسان ہو سکتی ہے کہ وہ مبالغہ آمیز مذہبی دعوے کر کے مصیبت زدہ غریبوں، جو معاشرے میں واضح اکثریت رکھتے ہیں، کی حمایت حاصل کر لیں۔ مصیبت اور پریشانی سے نکلنے کا حل کسی مذہب - مسیحیت ہو یا اسلام - کی اصل یا خالص شکل کی طرف رجوع میں ہے، یہ ایک آسان ترغیب ہے۔

مذہبی جنونیوں کے خلاف دارو گیر صورتِ حال کا کوئی مؤثر جواب نہیں ہے۔ اِس کا جواب انصاف، ترقی، مفید معاشی پروگراموں، نجی اور عوامی زندگی میں دیانت داری اور امیروں کی طرف سے غریبوں کے ساتھ واقعی یک جہتی کے اظہار کے ساتھ مسیحیوں، مسلمانوں اور دوسرے شہریوں کی مشترکہ لگن ہے۔ امن و سلامتی کی عمارت محبت، سچائی، اقتصادی ترقی، انصاف اور یک جہتی کے ستونوں پر کھڑی ہے۔

۶۔ روحانی پہلو پر مزید توجہ کی ضرورت

اگر دونوں طرف روحانی پہلو پر پہلے سے زیادہ توجہ دی گئی تو اکیسویں صدی میں مسیحی - مسلم تعلقات میں مزید پیش رفت ہو گی۔ دوسرے مذہب کے بارے میں علم، مذہبی آزادی، مشترک پروجیکٹ اور اجلاس اہم اور مفید ہیں، مگر یہ سب کچھ کافی نہیں۔ خداوند کے ساتھ زیادہ تعلق کی

ضرورت ہے۔ ایک مسلمان اور ایک مسیحی دُعاؤں، احکامِ خداوندی پر عمل کرنے میں کشادگی اور اُس کی مرضی پورے کرنے کے لیے جس قدر آمادہ ہوں گے، وہ اسی قدر ایک دوسرے کے زیادہ قریب بھی ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں بین المذہب تعلقات کو وہی مومنین بطریقِ احسن فروغ دیتے ہیں جو دلی طور پر مذہبی معاملات سے لگاؤ رکھتے ہیں۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اگلی صدی میں مسلم - مسیحی تعاون کو مزید فروغ دینے کی خواہش رکھتے ہیں، اُنہیں فریقین کو ترغیب دینا چاہیے کہ وہ تعلق باللہ کو زیادہ مضبوط کریں۔ دعا، سادگی، اخلاص اور ہمسائے کی محبت اور اپنے اندر خدا کی مرضی پر راضی ہونے کی صفت پیدا کریں۔ اِس بات کا زیادہ امکان ہے کہ ایک مسیحی رہنما اور ایک مسلم رہنما جو مضبوط روحانی طاقت کے مالک ہیں، ایک دوسرے کو سمجھ لیں اور بہتر تعلقات کو فروغ دینے میں کامیاب ہوں، بہ نسبت اُن دو عالم افراد کے جو اپنے قول پر کم ہی عمل کرتے ہیں۔

۷۔ ارضی وسائل کے استعمال پر مشترک تشویش

ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ عالمی آبادی کا ۲۰ فیصد حصہ ارضی وسائل کا ۸۰ فیصد استعمال کر لیتا ہے اور ۸۰ فیصد آبادی کے لیے ارضی وسائل کا صرف پانچواں حصہ باقی رہتا ہے۔ مزید برآں بعض امیر ممالک غذائی اجناس کی پیداوار کم کر دیتے ہیں تاکہ منڈی کی قیمتوں میں توازن رہے، جب کہ غریب ممالک کے باشندوں کے پاس کھانے کے لیے پوری مقدار میں خوراک نہیں ہوتی۔ اور کسی کو دلچسپی نہیں کہ ارضی وسائل جنگ، بے احتیاطی اور لالچ کے ہاتھوں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

آئندہ صدی میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے باہمی تعاون کے لیے یہ ایک اہم میدان ہے، کیونکہ لوگوں میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ اُن کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ اپریل ۱۹۹۶ء میں "پاپائی کونسل برائے مکالمہ بین المذاہب" اور "موسسہ آل البیت عمان (اردن)" کے زیر اہتمام روم میں منعقدہ مذاکرے میں اِس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مذکورہ بالا مسائل کے حوالے سے مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی رجحانات سامنے آنا چاہئیں۔

محترم خواتین و حضرات!

اکیسویں صدی میں مسلم - مسیحی روابط کیا سمت اختیار کریں، میں نے اِن میں سے بعض کی طرف محض اشارہ کیا ہے۔ خداوند ہمیں توفیق دے کہ مسلم اور مسیحی دونوں اِس دعوت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال نہ دیں۔